صارفیت__ شعرا کے تصرّف میں

حافظہ عائشہ صدیقہ

Hafiza Ayesha Siddiqa

M.Phil Scholar, Department of Urdu,

Lahore Garrison University, Lahore.

توقیر اشرف

Tauqir Ashraf

Ph.D Scholar, Department of Urdu,

Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

Allah Almighty has subjugated all the blessings of this universe to man.Its upto man to decide how to use them. Poets have taken consumerism from many angles.Apart from the transaction of wealth, it is also the transaction of passions, love, values etc. Where there is a purchase of worldly goods, there is also a bargain of loyality, sincerity and love etc. Sometimes the prices are high that it cannot be paid and sometimes the deal is done at a glance of the beloved. This article attempts to give an overview of the poet's concept of consumerism.

اللہ رب العزت نے انسان کو دنیا میں ضروری احتیاجات کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کی سرشت میں ان کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت ودیعت کر دی ہے۔اس کے گرد چہار جانب قدرت کی نعمتوں کے انبار ہیں جنھیں وہ اپنی ضرورت کے مطابق اپنے مصرف میں لا سکتا ہے اور موقع محل کے مطابق ان میں تصرف کر سکتا ہے۔بسا اوقات محدود وسائل کی فراہمی کے باعث وہ اپنی احتیاج کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کا محتاج نظر آتا ہے۔اسی رویے کے باعث انسانوں میں باہمی لین دین کا آغاز ہوا، جس کا سرا انسانی تاریخ کی ابتدا سے جا ملتا ہے۔لوگ اپنی ضرورت کے مطابق آپس میں چیزوں کا تبادلہ کرتے تھے۔یہی معاملات لین دین اپنے ارتقائی اور تغیراتی مراحل طے کرتے ہوئے موجودہ دور میں صارفیت کہلاتے ہیں۔

صارفیت، صرف سے بنا ہے۔صرف سے مراد خرچ، اخراجات ہے۔(۱) صرف کرنا سے مراد خرچ اٹھانا یا خرچ میں لانا کے ہیں۔اسی طرح صرف ہونا خرچ ہونا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔(۲) صرفہ بھی اسی سے بنا ہے جو کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، صرفہ:

(۱) فراوانی، زیادتی، غلبہ

(۲) کفایت شعاری میں زیادتی، بخل، خرچ میں تنگی، احتیاط، کنجوسی، بخیلی

کب لطف زبانی کچھ اس غنچہ دہن کا تھا
برسوں ملے پر ہم سے صرفہ ہی سخن کا تھا
(میرؔ)

کیوں صرفہ نگاہ مری جان ہو گیا
اک تیر اور میں تیرے قربان ہو گیا
(داغؔ)

(۳) دریغ، افسوس، خیال، لحاظ، بچاؤ(۳)

صرف مادہ سے کئی لفظ مثلاً صارف، مصرف، مصارف، تصرف، صرفہ، صرفہ ہونا وغیرہ وجود میں آئے ہیں جو ہماری روزمرہ بول چال میں مستعمل ہیں۔اس سے کئی محاورات اور مرکبات بنے ہیں جو ہماری زبان و بیان کا حصہ ہیں، مثلاً صرف بیٹھنا، صرفِ بے جا، صرفِ خاص، صرف شدہ، صرف فرمانا، صرف کثیر، صرف میں آنا وغیرہ۔صارفیت میں خریدار (گاہک ر مشتری)، مال (سودا)، نرخ، سود و زیاں، نقد و ادھار، جنس کی کثرت و قلت، ارزانی و گرانی، خرید و فروخت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔شاعری جو کہ ازلی و ابدی صداقتوں کی ترجمان ہوتی ہے، اس میں ہر تصور اور ہر خیال بخوبی جگہ پاتا ہے۔صارفیت کے مصرف کا تصرف ہماری شاعری میں پورے عصری شعور کے ساتھ نظر آتا ہے۔ہمارے شعرا کرام نے حالات کی رنگینی و سنگینی کو ہمیشہ بلیغ و جامع انداز میں سپردِ قرطاس کیا ہے۔زیرِ نظر مضمون میں شعرا کرام کے ہاں تصور صارفیت کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ان کے نزدیک صارفیت صرف ایک معاشی و معاشرتی رجحان نہیں بلکہ یہ جذبات و اقدار، انتشار و اضطراب، امنگوں اور آرزوؤں، وفا و جفا، ضبط و انقیاد، تصورات و خیالات کا بھی لین دین ہے۔اس میں ہر جنس کا سودا ہے جس کے سوداگر کہیں ارزاں اور کہیں گراں قیمتوں پر ان کے خریدار بنتے ہیں۔کہیں ان کے اوزان مقرر ہیں اور کہیں یہ انمول خزانے بے مول لٹا دیے جاتے ہیں۔جہاں جس چیز کی روانی و فراوانی ہوتی ہے وہاں اس کی کھپت میں بھی اضافہ دیکھنے میں آتا ہے۔اس بازار میں کاروبار محبت کا بھی بیوپار ہوتا ہے اور کہیں جذبوں سے سروکار رہتا ہے۔جہاں شاعروں نے اجناس کی فراوانی، قدردانی، ارزانی و گرانی کا ذکر کیا ہے وہاں معاملات خرید و فروخت اور طبع خریدار کو بھی موضوع بنایا ہے۔ہماری شاعری میں ان موضوعات پر مختلف نوع کے کثیر اشعار نظر آتے ہیں۔شاعر جو معاشرے کے نبض شناس ہوتے ہیں وہ اپنی حقیقت پسندی اور تخیل کی بلند پروازی سے عام عوام کی سطح پر رہتے ہوئے بھی زیادہ بامعنی اور پہلودار بات کرتے ہیں یہی وجہ ہے کی ان کی شاعری کے انتخاب میں ایسا ابتکار و انکشاف موجود ہے، جو آج کا مرقع حال معلوم ہوتی ہے۔شعرا کرام صارفیت کی مد میں صرف صارف کے مصرف اور تصرف کا ذکر ہی نہیں کرتے بلکہ اپنی ژرف نگاہی کی بنا پر آنے والے حالات کا جائزہ لے کر نہ صرف ہمیں خبردار و ہوشیار کرتے ہیں بلکہ ہمیں اصول معاشرت اور معیشت کے گر بھی سکھاتے ہیں۔مختلف قسم کے معاشی حالات میں فرار و اختیار کے دونوں راستے ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ان کے خیالات کی جدت و ندرت میں اتنی تازگی اور مہک ہے کہ وہ ہر دور کے لوگوں کے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ان کے خیالات میں جہاں حالات کے انتشار و افتراق کا ردعمل نظر آتا ہے وہاں قرآن و حدیث کی تعلیمات بھی واضح دکھائی دیتی ہیں۔جیسے ناپ تول میں انصاف سے کام لینا، مول کا پورا تول دینا، اپنی چیز کا عیب خود واضح کرنا، نقد سودا کرنا وغیرہ۔

ہمارے شعرا کرام بھی لین دین کے معاملات میں نقد سودا کرنے پر قائل نظر آتے ہیں۔ وہ ادھار پر مائل نہیں ہیں کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ادھار سودے کی قدر گھٹ جاتی ہے۔ادھار کاروبار کے معیار کو گھٹا دیتا ہے۔سودا وہی اچھا ہے جس میں کاروبار کا معیار اور وقار قائم رہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک ہاتھ قیمت ادا کی جائے اور دوسرے ہاتھ چیز وصول کی جائے۔جیسے نظیرا کبرآبادی ہمیں خرید وفروخت کا اصول بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

کیا خوب سودا نقد ہے
اس ہات دے اس ہات لے(۴)

اسی طرح دیگر شعرا کرام بھی اسی بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ لین دین میں ادھار کا قائل نہیں ہونا چاہیے۔ادھار سے بہت سے آزار ملنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔یہ مروت ولحاظ کو ختم کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔اس سے معاملات اور تعلقات، دونوں بگڑنے کا احتمال رہتا ہے۔اسی لیے سودا جس قدر ہو،نقد ہونا چاہیے۔

ساغر بقدرِ ظرف لٹاتا ہوں نقد ہوش
ساقی سے میں ادھار کا قائل نہیں ہوں(۵)

دل و دیں نقد لا ساقی سے سودا گر کیا چاہیے
کہ اس بازار میں ساغر متاع دست گرداں ہے(۶)

خریدار سودا کرتے وقت اس سودے میں ہونے والے منفعت ونقصان کو ضرور مدنظر رکھتا ہے۔وہ ایسے سودے سے ہرممکن گریز کرتا ہے جس میں اسے نقصان یا گھاٹے کا خدشہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ معاملات لین دین طے کرتے ہوئے اسے عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔معاملہ چاہے خریداری کا ہو یا فروخت کا،عقل ونظر والے ہمیشہ سود وزیاں پر،نفع ونقصاں پر دھیان دیتے ہیں۔عقل والے وہ سودا ہی نہیں کرتے جس میں ان کو اپنا زیاں نظر آتا ہو۔

دل کے لینے تک ہے بس آپ کی خریداری
کیوں کریں وہ سودا ہم جس میں ہو زیاں اپنا(۷)

لیکن یہ فیصلے ہوش وخرد والے کرسکتے ہیں۔جو ہوش وخرد کی منزل سے آگے نکل جاتے ہیں وہ نہ نفع دیکھتے ہیں، نہ خسارہ۔وہ صرف اپنے دل کا سکون واطمینان چاہتے ہیں۔وہ اپنے محبوب کی رضا چاہتے ہیں۔وہ دنیا کے نفع کے طالب نظر آتے ہیں نہ آخرت کے۔ان کا مطمعِ نظر صرف اپنے محبوب کی چاہت ہوتا ہے۔وہ دنیا کی لعنت وملامت کو محض حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیوں کہ ان کی چشمِ بینا وہ منفعت دیکھنے کے قابل ہو جاتی ہے جو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ایسے سوداگر رب کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی انا کا سودا کر لیتے ہیں۔بظاہر دنیا کی نگاہ میں وہ خسارے کا جوگ کما لیتے ہیں لیکن وہ ایسی متاع کو پالیتے ہیں جس کے سامنے دنیا کے سب سودے ہیچ ہیں۔اقبال اس بارے میں کہتے ہیں:

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں(۸)

شعرا کرام جب اس کارِ جہاں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اس بازار میں فروخت ہونے والی اجناس کا تفصیلی ذکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔یہاں پر مختلف انواع کی متاع بکنے کے لیے سر بازار آجاتی ہے،جس کے مول اس کے تول پر مقرر کیے جاتے

ہیں۔جس مال کی ظاہری چمک دمک، خراش تراش بہترین ہو، وہ بہت مہنگے داموں فروخت ہوتا ہے۔ بھلے اس پر یہ مقولہ صادق آتا ہو کہ ''ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔'' یہی حال ہمیں آج بھی خرید وفروخت کے معاملے میں دیکھنے میں نظر آتا ہے۔خریدار ہر مہنگی چیز کو یا ہر اس چیز کو جس کا مول زیادہ لگایا جائے، بہترین کے زمرے میں شمار کرتا ہے اور یہ ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے کہ ایسی چیز کو پا لینے کی خواہش کو لوگ اپنے دل میں پالتے ہیں اور جب وہ اس کو خواب کو حقیقت میں ڈھالتے ہیں تو باقی ماندہ کے سامنے اتراتے نظر آتے ہیں اور ان کو کمتری اور حسد جیسی بیماری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ ہمارے موجودہ معاشرے میں بے چینی و بے قراری کی ایک بڑی وجہ ہے۔ جو چیز پہنچ سے جتنی دور ہو، وہ اتنی ہی دل پسند نظر آتی ہے۔خواہ وہ جنس ہو یا نقد، اس کو حاصل کرنے کی معاشی تگ ودو بہت حد تک صارف کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔اور گاہک کی توجہ حاصل کرنے کے لیے یہ بچھایا جانے والا ایسا دلکش جال ہے، جس کے دام میں اگر وہ پھنس جائے تو نکلنا بہت مشکل یا ناممکن ہوتا ہے۔جنس محبت کا انبار بھی اس کارِزار میں ایسا کاروبار ہے، جس کے بظاہر تو بہت خریدار ہیں لیکن وہ اس متاع انمول کی صحیح قدر و قیمت لگانے سے قاصر ہیں۔اس کے خریدار ہونے کا دعویٰ تو ہر کوئی کرتا دکھائی دیتا ہے لیکن اس کا بار اٹھانے سے ہر کوئی قاصر نظر آتا ہے کیوں کہ یہ متاع بے بہا کی اصل پہچان ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔اس لیے تو میرؔ اس بات پر نوحہ کناں نظر آتے ہیں کہ جنسِ محبت کے لیے سر دینے والے عاشق تو بے شمار ہیں لیکن اس کا اصل خریدار کوئی دکھائی نہیں دیتا ہے۔

ہر جنس کے خواہاں ملے بازارِ جہاں میں
لیکن نہ ملا کوئی خریدارِ محبت
ہر نقشِ قدم پر تیرے سر بیچے ہیں عاشق
ٹک سیر تو کر آج تو بازارِ محبت(۹)

محبت ایسا سودا ہے، جس تن میں، من میں سما جائے اس کی قدر و قیمت کو بڑھا دیتا ہے۔

جا گزیں جب سے ہوئی تیری محبت دل میں
بڑھ گئی اور بھی اس جنس گراں کی رونق(۱۰)

اسی لیے جو لوگ اس کو خریدنے کی سکت نہیں رکھتے وہ اس سے گریزاں دکھائی دیتے ہیں۔وہ اس کو بلائے جان سمجھتے ہوئے اپنے لیے دردِ سر مول نہیں لینا چاہتے۔

محبت کوڑیوں کے ہو اگر مول
بنی آدم نہ لے یہ دردِ سر مول(۱۱)

بلا اپنے لیے دانستہ ناداں مول لیتے ہیں
عبث بیچ کر الفت کو انساں مول لیتے ہیں(۱۲)

جنس وفا بھی ایسی متاع ہے کہ اول تو میسر ہی کم آتی ہے اور اگر جہاں پہ مل بھی جائے تو اسے قدر کی نہیں، شک کی نگاہ سے پہلے دیکھا جاتا ہے۔اسے بار ہا پرکھا جاتا ہے۔اس میں کھوٹ تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بہت سے تکلیف دہ مراحل سے گذارنے کے بعد اس کے صحیح ہونے کا یقین کیا جاتا ہے۔ پھر بھی اسے خریدنے کی سکت بہت کم لوگ رکھتے ہیں کیوں کہ اس کے نرخ بہت زیادہ ہیں۔جنسِ وفا جتنی سچی اور کھری ہو وہ قیمت کے بدلے اتنی ہی وفا چاہتی ہے۔اس لیے اس جنس کی

خریداری مشکل نظر آتی ہے۔

وفا سے دشمنی رکھ کر مرے دل کی طلبگاری
بہت مشکل ہے اس جنس گرامی کی خریداری(۱۳)

لوگ جنسِ وفا کو متاعِ گم گشتہ سمجھ بیٹھے ہیں، اس لیے جہاں میسر آ بھی جائے تو بھی اس کا یقین نہیں کرتے۔

قدر نشناش ہے جفا تیری
ورنہ جنس وفا نہیں کمیاب(۱۴)

اسی لیے لوگ آج کل اس کار جہاں میں اس کو سر بازار لانے سے گریزاں دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ اس کی قدر جاننے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

کیا کروں جنسِ وفا پھیرے لیے جاتا ہوں
بخت بد نے نہ اسے دل کا خریدار کیا(۱۵)

جنسِ دل بھی ایسا مال ہے جس کا بازار میں بہت چرچا ہے۔ اگر یہ صحیح حالت میں میسر آ جائے تو اس کے ہزاروں خریدار ہیں لیکن اس کی شکستگی اس کے مول کو گھٹا دیتی ہے۔ جس طرح ثابت و سالم ظروف کو تو کوئی بھی خریدنے کے لیے دام لگا دیتا ہے لیکن اگر وہ ٹوٹ جائے تو کوئی اسے لینا پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح دل بھی ایک پیالے کی مانند ہے جو اصل حالت میں ہو تو اس میں ہر قسم کی محبت سما سکتی ہے لیکن ٹوٹے دل کو جوڑنا اور اسے قابلِ استعمال بنانا جان جوکھم کا کام ہے۔ اس کی نازکی کے باوجود ہزاروں عشاق اس کے مشتاق دکھائی دیتے ہیں۔

دل کے گاہک تو ہزاروں ہی پری رو دیکھے
دیکھیے جان حزیں کے بھی خریدار کی شکل(۱۶)

لیکن اس متاعِ بیش بہا کا حق دار کو وہی خریدار بنتا ہے جو اس کی قدر جانتا ہے۔

یہ جنس دل مقرر اک نظر اس کو دکھاویں گے
جو کوئی مشتری بازار عالم میں حسیں آیا(۱۷)

کچھ لوگ سودا طے کرنے سے قبل اس متاع کی قیمت کا تعین کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے مال کے کتنے نرخ ان کا مقدر بنیں گے۔

میں اور مجھ سے دردؔ! خریداری بتاں
ہے ایک دل بساط میں، سو کس حساب میں(۱۸)

خریدار جنس دل کو خریدتے تو بہت شوق سے ہیں لیکن ہر کوئی اسے سنبھال کے رکھنے کا اہل نہیں ہوتا۔ وہ اسے توڑ پھوڑ کر اسے شکستہ و خستہ بنا کر پھر سے بکنے کے لیے پھینک دیتے ہیں لیکن اس کی شکستگی و خستگی دیکھ کر کوئی اسے لینا نہیں چاہتا۔

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا(۱۹)

سن اے! غارت گر جنسِ وفا، سن
شکست قیمت دل کی صدا کیا؟(۲۰)

قدر رکھتی نہ تھی متاع دل
سارے عالم میں، میں دکھا لایا(۲۱)

جنسِ حسن ایسی قیمتی جنس ہے، جس بازار میں میسر ہو، وہاں خریداروں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ ہر کوئی اس سودے کو اپنی بساط کے مطابق خریدنا چاہتا ہے۔ اس کی رسد ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے اور اس کے طلب گار اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں چاہے انھیں اپنی جانوں کا سودا ہی کیوں نہ کرنا پڑ جائے۔

عالم فریب حسن دلآویز یار ہے
سکہ کھرا ہے کیوں نہ ہوں بازار کی پسند(۲۲)

جب سے لے نکلا ہے تو یہ جنس حسن
پڑ گئی ہے دھوم بازاروں کے بیچ(۲۳)

ہے حسن کیا متاع کہ جس کو نظر پڑی
وہ جان بیچ کر ہی خریدار ہو گیا(۲۴)

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں کیے ہوئے(۲۵)

اصول معیشت ہے کہ جو جنس کم یاب نہ ہو اس کی قیمت ارزاں ہو جاتی ہے لیکن اس بازار کے اصول نرالے ہیں اس جنس کی قیمت بھی گراں ہوتی ہے جو بکثرت موجود ہو۔

سرفروشوں کے اگر آپ خریدار ہو رہے
تو گراں ہووے گی وہ جنس جو کم یاب نہیں(۲۶)

اس بازار میں فروخت ہونے والی اشیا و اجناس کے کہیں مہنگے اور من پسند دام وصول کیے جاتے ہیں لیکن کہیں یہ سودا صرف اک نگاہ کے عوض ہی طے پا جاتا ہے۔ نگاہِ یار کی اک نگہ کرم ہی دل حزیں کی تسکین کا سامان بن جاتی ہے اور اسی دِل فریب نگاہ ہی پر متاع جاں کو بیچ دیا جاتا ہے۔

ٹھہرا ہے اِک نگاہِ کرم پر معاملہ
اے لطفِ یار مفت ہے جنسِ گراں دل(۲۷)

جہاں اس بازارِ محبت میں کاروبارِ حیرت وحسرت طے پاتے ہیں، اشیا و اجناس کی قیمتوں کی گراں باری خریدار کو پریشاں و حیراں کر دیتی ہے، وہاں بسا اوقات بیش بہا قیمت کی چیز کوڑیوں کے مول بھی نہیں بکتی۔ اس میں سرِفہرست انسانی جان آتی ہے۔ کوئی بھی انسانی جان قدر تب ہی پاتی ہے جب وہ اپنی جان سے جاتی ہے۔

ہو گی نہ قدر جان کی قرباں کیے بغیر
دام اٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کیے بغیر(۲۸)

انسانی جان کی ارزانی کو شعرا کرام نے مختلف صورتوں میں بیان کیا ہے۔ بنیادی طور پر اس میں معاشرے کی اخلاقی گراوٹ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قبل از اسلام بھی جس طرح غلاموں کی خرید و فروخت کا بازار لگتا تھا جہاں غلام نہایت سستے دام بکتے تھے۔ اس کی ایک مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی نظر آتی ہے کہ جس طرح وہ بازار مصر میں بکنے کے لیے آئے لیکن بعد ازاں وہ شاہ مصر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس موضوع کو بھی شعرا کرام نے مختلف زاویوں سے دیکھا اور قلم بند کیا ہے۔ کہیں پر وہ اس قیمتی مال کے چند داموں بکنے پر دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ کہیں وہ بازار کے سوداگروں کی کم عقلی پر پیچ و تاب کھاتے نظر آتے ہیں کہ وہ اس مال کی قدر نہ جان سکے۔ کہیں وہ جنس حسن کی ارزانی پر رنجیدہ ہیں کہ حسن یوسف جس کی مثال نہیں نظر آتی، وہ بھی بکنے کے لیے سر بازار آ گیا اور کہیں وہ اس بارے میں سنجیدہ ہیں کہ اگر زلیخا جیسا خریدار حسن یوسف کا طلب گار بن جائے تو وہ منظر قابلِ دید ہوگا۔

زلیخا کا سا گاہک حضرت یوسف سا مال
دیدنی ہے آج رونق مصر کے بازار کی(۲۹)

غلاموں کی خرید و فروخت کا یہ سلسلہ مختلف حالتوں میں جاری و ساری رہا۔ برصغیر کے معاشی حالات جنھوں نے شعرا کرام کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا، وہ اس بات کے غماز ہیں کہ انسانی جان کی کچھ بھی قدر و قیمت باقی نہ رہی۔ اغیار کے بیرونی حملوں نے اس کا بین ثبوت پیش کیا جب بے قصور اور مجبور لوگوں کا قتل عام کر کے کھوپڑیوں کے ڈھیر لگائے گئے۔ یہ انسانی تاریخ کا سب سے سیاہ اور الم ناک باب دکھائی دیتا ہے کہ جس انسان کے لیے یہ دنیا کے ہنگامے دکھائی دیتے ہیں، اسے اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا گیا، لیکن بازارِ دنیا میں اس کی جان کی قیمت اتنی سستی طے پائی۔ حالیؔ اسی بات پر آزردہ دکھائی دیتے ہیں کہ یہ استخوان تو مفت بھی اپنی جان دے دے تو اتنی بھی قیمت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

بکے مفت یاں ہم زمانہ کے ہاتھوں
یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ(۳۰)

فیضؔ انسانی جان کی ارزانی کو یوں بیان کرتے ہیں کہ اہلِ مصر تو چند سکوں کے عوض انسانی جان کا سودا کرتے تھے، ہم جاں دینے پر آئے تو بے دام بیچ دی۔

جاں بیچنے کو آئے بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر ، وضع تکلف تو دیکھیے(۳۱)

اس میں جہاں شاعر حضرات انسان کے بے مول ہونے پر اندرونی دکھ رنج کا اظہار کرتے ہیں، وہاں وہ ہونے والے معاشی استحصال کو بھی آشکار کرتے ہیں۔ شاعر ذکی الحس ہونے کے باعث معاشرے کی حالت سے زیادہ متاثرہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ شعر کی رمز و ایمائیت اور جامعیت میں جہاں دل کی لگاوٹ اور محبت کی حلاوت کو بیان کرتا ہے، وہاں وہ ایسے تلخ حقائق کی چشم نمائی کرتا ہے جس سے نظریں چرانا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا کرام نے جن حقیقتوں سے روشناس کروایا، اس میں ہمیں موجودہ صورتحال بھی واضح دکھائی دیتی ہے۔ جو انتشار و اضطراب اس دور میں نظر آتا تھا ویسی ہی شورشیں آج بھی سنائی اور دکھائی

دیتی ہیں۔ گو بظاہر حالتیں مختلف ہوں لیکن وہی ذہنی انتشار و خلفشار، باہمی منافرت اور شکست خوردگی جیسے عوامل اس بازار جہاں میں دکھائی دیتے ہیں۔ مفلس ولاچار انسانوں کا معاشی استحصال اسی طرح جاری و ساری ہے۔ اس منڈی میں انسانی قدر کی سب سے زیادہ ناقدری دکھائی دیتی ہے۔ مزدور اور مفلوک الحال طبقہ حالات کی ستم زدگیوں سے تنگ آ کر اپنے اعضا بیچ ڈالتے ہیں۔ اس بازار میں وہ خریدار بن کر نکلتے ہیں تو اپنی جیب کو خالی پا کر کچھ نہ خریدنے کی سکت دیکھ کر وہ اپنی جان تک کا سودا کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے ہمیں سر بازار 'انسان برائے فروخت' نہایت سستے داموں میں بکتا نظر آتا ہے۔

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے(۳۲)

جب انسان کے بکنے کی بات آتی ہے سب سے زیادہ بے مول چیز اس کی شرافت قرار پاتی ہے۔

اے شرافت! تجھے بکنا ہے اگر مفت تو بک
آج کل کیجیے کیا ہے یہی بازار کا بھاؤ(۳۳)

جو لوگ کاروبارِ تجارت میں حلال و حرام کی تمیز بھول کر دنیا کے عارضی مال کے حرص و ہوس میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ کچھ بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ اپنے ضمیر کا، اپنی غیرت کا، حتیٰ کہ اپنے ایمان کا بھی سودا کر بیٹھتے ہیں۔

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں(۳۴)

ہم سے خود دنیا ہی پٹتائی نہ حالی ورنہ یاں
دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم(۳۵)

لوگ بازارِ تجارت میں اپنا ہنر بیچ کر اپنی روزی کا اہتمام کرتے ہیں لیکن کچھ ایسے مکروہ و قبیح دل کے لوگ ہوتے ہیں جو علم و قلم کا چند کھوٹے سکوں کے عوض سودا کر لیتے ہیں۔

ادب میں اب کہاں دل کا اجالا
ادیبوں نے قلم کو بیچ ڈالا(۳۶)

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان(۳۷)

اور کچھ ایسے ننگِ انسانیت ہوتے ہیں جو اپنی قوم و ملت اپنی تہذیب کا سودا کر بیٹھتے ہیں اور مجرم انسانیت ٹھہرتے ہیں۔ ایسے ہی اسفال کی بدولت ملتوں کا سودا ہوتا ہے اور طاقتور اقوام ایسی قوموں کے خریدار بن کر ان کو عاجز و مغلوب کر کے ان کا معاشی استحصال کرتے ہیں۔ جن کے بارے میں اقبالؒ کہتے ہیں:

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملت مظلوم کا یورپ ہے خریدار(۳۸)

اس لیے اقبال نے اپنی شاعری میں خودی کی پہچان پر بطورِ خاص زور دیا ہے۔ جو لوگ اپنی خودی کو پہچان لیتے ہیں وہ

اپنی قدر و قیمت جان لیتے ہیں پھر وہ اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتے۔ اس لیے ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنی خودی کی پہچان کے لیے سرگرداں رہے۔

بسا اوقات بازار میں اتنی نایاب چیز بکنے کے لیے آجاتی ہے کہ لوگ اس کی قدر و قیمت پہچاننے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ اس کی صناعی کو دیکھ کر اس کے مصرف کو نہیں سمجھ پاتیں۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دکاں سب سے الگ(۳۹)

اس لیے مال کی قدر جاننے کے لیے خریدار کا قدر شناس اور بصیرت کا حامل ہونا ضروری ہے۔

مقدرت شرط ہے ہر چند کہ ہو قدر شناس
بے بصیرت نہ سمجھ لو جو خریدار نہ ہو(۴۰)

لیکن حالی اس بات پر زور دیتے نظر آتے ہیں کہ بیچنے والوں کو اپنے مال کی قدر و قیمت کا خود معلوم ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ اپنی چیز کو حقیر جانے گا تو گاہک سے اس کا صحیح مول وصول نہیں کر پائے گا۔

گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم
اپنی نظر میں ہو گا گر وزن کم تمہارا(۴۱)

الغرض اس بازار دنیا میں ہر جنس کا خریدار اور ہر سودے کا بیوپار نظر آتا ہے۔ لیکن معاشی استحکام کے لیے جتنی پیداوار ہو اتنی کھپت بھی ضروری ہے ورنہ توازن بگڑنے کا احتمال رہتا ہے۔ عصر حاضر کے تناظر میں یہ توازن بگڑتا دکھائی دیتا ہے۔ جب بھی کسی بستی یا کسی مقام پر کوئی آفت نازل ہوتی ہے تو وہاں کی معیشت سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ موجودہ حالات میں یہی کش مکش دکھائی دیتی ہے۔ جہاں میل جول میں فاصلے بڑھ گئے ہیں، وہاں وبا کی آفت نے معیشت تباہ کر دی ہے جس کے باعث ہر کاروبار مندا دکھائی دیتا ہے۔

مندا ہے اختلاط کا بازار آج کل
لگتا نہیں ہے دل کا خریدار آج کل(۴۲)

کچھ خریدا نہیں ہے، اب کے سال
کچھ بتایا نہیں ہے، اب کی یار(۴۳)

درج بالا اشعار اس بات پر دال ہیں کہ شعرا کرام نے جہاں عشق و محبت کے نغمے گنگنائے ہیں، وہاں معاشرے کے المیے بھی سنائے ہیں۔ ان کا کلام عصری شعور و کرب سے بھرپور نہ صرف اپنے دور کی نمائندہ آواز ہے بلکہ اس میں ان کے عہد سوز وساز بھی سنائی اور دکھائی دیتے ہیں۔ تصور صارفیت شعرا کے کلام میں وسیع معنوں میں پایا جاتا ہے۔ اس میں ہر جنس کی خرید و فروخت کا ذکر ہے۔ زر عیار اور طبع خریدار کو بھی احاطہ سخن میں لایا گیا ہے جن کے ذریعے اصول معیشت و معاشرت کے گر بھی سکھائے گئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ حقی، شان الحق، فرہنگ تلفظ، اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان، طبع اول، ۲۰۱۷ء، ص: ۵۰۰

۲۔ احمد دہلوی، سید، مولوی، فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، لاہور: اردو سائنس بورڈ، طبع ششم، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۱۹

۳۔ ایضاً، ص: ۲۱۹

۴۔ نظیر اکبر آبادی، اشعار نظیر، مرتبہ: حافظ شمس الدین احمد منیر، الہٰ آباد: لالہ رام نرائن لعل بک سیلر، بار اول، ۱۹۴۰ء، ص: ۱۰۷

۵۔ ساغر صدیقی، کلیات ساغر صدیقی، لاہور: الریاض ناشران، س ن، ص: ۴۳

۶۔ غالب، مرزا، دیوان غالب، نسخہ طاہر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۲۵

۷۔ مومن، مومن خان، دیوان مومن، حیدر آباد: تاج اکیڈمی، ۱۹۶۷ء، ص: ۳۳

۸۔ محمد اقبال، علامہ، بانگ درا، مشمولہ: کلیات اقبال، لاہور: علم و عرفان پبلشر، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۳۸

۹۔ میر، میر تقی، دیوان اول، مشمولہ: کلیات میر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص: ۵۸

۱۰۔ حسرت موہانی، کلیات حسرت، کراچی: حسرت موہانی میموریل ولائبریری ٹرسٹ، بار دوم، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۶۳

۱۱۔ آتش، حیدر علی، خواجہ، کلیات آتش، مرتبہ: مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، لاہور: مجلس ترقی ادب، اشاعت دوم، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۵۱

۱۲۔ ایضاً، ص: ۲۷۰

۱۳۔ حسرت موہانی، کلیات حسرت، ص: ۱۷۶

۱۴۔ ایضاً، ص: ۱۵۳

۱۵۔ میر، میر تقی، کلیات میر، ص: ۲۴۴

۱۶۔ آتش، حیدر علی، خواجہ، کلیات آتش، ص: ۲۵۰

۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۱۲

۱۸۔ درد، دیوانِ درد، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۹ء، ص: ۵۲

۱۹۔ آتش، حیدر علی، خواجہ، کلیات آتش، ص: ۶۴

۲۰۔ غالب، مرزا، کلیاتِ غالب، مرتبین: ڈاکٹر محمد خاں اشرف، ڈاکٹر عظمت رباب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۰۲

۲۱۔ میر، میر تقی، کلیات میر، ص: ۳۳

۲۲۔ آتش، حیدر علی، خواجہ، کلیات آتش، ص: ۲۱۰

۲۳۔ میر، میر تقی، کلیات میر، ص: ۶۰

۲۴۔ ایضاً، ص: ۵۳۹

۲۵۔ غالب، مرزا، کلیات غالب، ص: ۲۸۰

۲۶۔ مومن، مومن خان، دیوان مومن، ص: ۶۸

۲۷۔ حسرت موہانی، کلیات حسرت، ص: ۱۶۵

۲۸۔ حالی، الطاف حسین، دیوانِ حالی، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۱ء، ص: ۲۱۵

۲۹۔ اکبرالہ آبادی،کلیات اکبرالہ آبادی، حصہ دوم، الہ آباد: پرنٹنگ ورکس،طبع پنجم،۱۹۲۶ء،ص:۴۲

۳۰۔ حالی، الطاف حسین، دیوانِ حالی، ص:۳۱۰

۳۱۔ فیض،فیض احمد،کلیاتِ فیض، دلی: پرویز بک ڈپو،س ن، ص:۱۷

۳۲۔ ایضاً، ص:۳۳

۳۳۔ حالی، الطاف حسین، دیوانِ حالی، ص:۳۰۵

۳۴۔ فیض،فیض احمد،کلیاتِ فیض، ص:۴۹

۳۵۔ حالی، الطاف حسین، دیوانِ حالی، ص:۲۶۳

۳۶۔ حبیب جالب،کلیاتِ حبیب جالب، لاہور: ماوا پبلشرز، باراول،۱۹۹۳ء،ص:۱۹۸

۳۷۔ محمداقبال، علامہ،ضربِ کلیم،مشمولہ: کلیاتِ اقبال، ص:۶۳۱/۱۶

۳۸۔ ایضاً، ص:۶۱۵/۱۵۳

۳۹۔ حالی، الطاف حسین، دیوانِ حالی، ص:۲۵۷

۴۰۔ اکبرالہ آبادی،کلیاتِ اکبرآبادی، ص:۲۲

۴۱۔ حالی، الطاف حسین، دیوانِ حالی، ص:۱۳۶

۴۲۔ میر،میرتقی،کلیاتِ میر، ص:۸۷

۴۳۔ غالب،مرزا،کلیاتِ غالب، ص:۳۲۰

☆......☆......☆